تلخیص و ترجمہ

عربوں کی قومی تحریک اور جنگ

انگریزی کے مشہور سہ ماہی رسالہ "دی ماؤنڈ ٹیبل" ستمبر ۱۹۴۱ء میں مندرجہ بالا عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عربوں کو کس طرح گذشتہ جنگِ عظیم میں حکومتِ خود اختیاری کا سبز باغ دکھا کر ترکوں سے علیحدہ کیا گیا۔ اور پھر جنگ کے ختم پر جب ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تو ان میں برطانیہ اور فرانس کے خلاف شکایات کے پیدا ہو جانے کے باعث کس طرح بے چینی پیدا ہوئی اور اس کے دیگر اسباب و نتائج کیا تھے۔ اگرچہ ہم پورے مضمون سے متفق نہیں ہیں۔ تاہم اس میں عربوں کی قومی تحریک سے متعلق بعض نہایت مفید اور اہم معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ اسلئے ہم ذیل میں اس مقالہ کا ملخص ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

مئی ۱۹۴۱ء کا ہنگامۂ عراق، اہلِ برطانیہ کے لئے بالکل خلافِ توقع تھا۔ اخبارات میں مشرقِ وسطیٰ کی جنگ کے آغاز سے برابر خبریں آ رہی تھیں کہ مفتیِ اعظم فلسطین جیسے چند کٹر دشمنوں کو چھوڑ کر عرب عام طور پر ہمارے ساتھ ہیں، اپریل میں تو برطانی اخبارات اور ریڈیو بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ عراق کی "باغی حکومت" اس معاہدہ کی جو برطانیہ اور عراق کے درمیان ہوا تھا پوری پابندی کر رہی ہے۔ ایسی حالت میں اگر جانبہ پر بمباری کی اطلاع سنگ آمد و سخت آمد ثابت ہوئی تو کیا تعجب ہے۔

درحقیقت، عراق کا یہ ہنگامہ اس بات کی قوی علامت ہے کہ عربوں میں نفرت کا ایک عام جذبہ پایا جاتا تھا اور عراق کے لیڈر محض نازیوں کے بل بوتے پر مقابلہ نہیں کر رہے تھے بلکہ انھیں یہ بھی خیال تھا کہ عرب کی دوسری حکومتیں ان سے ہمدردی کریں گی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ عرب

رضا کاروں نے اپنا دامن بچایا اور عرب کی حکومتوں نے اپنے رویہ سے ان کے خیال کی تردید کی تو انھیں مایوسی ہوئی اور ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں، مگر اب عراق کے اندر آزادی کی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور اگرچہ اس کے اثرات ہنوز اچھی طرح سے ظاہر نہیں ہوئے ہیں، لیکن ۱۹۲۰ء کی تحریک کو اس سے کچھ نسبت نہیں ہے۔

عراق کا یہ واقعہ ممالک عربیہ کی باہمی سیاسی کشیدگی اور برطانیہ عظمیٰ اور اس کے اتحادیوں کے درپیش مسائل پر پوری روشنی ڈالتا ہے، ان میں سب سے اہم مسئلہ عراق اور شام کا ہے، مگر بنیادی طور سے تمام ممالک عرب میں جن میں مصر بھی داخل ہے انھیں مسائل کا سامنا ہے، سچ پوچھئے تو یہ مسائل عالم عربی کے ساتھ ہی خاص نہیں ہیں بلکہ ان کا دائرہ مشرق وسطیٰ کی ان سیاسی پیچیدگیوں تک وسیع ہے، جو خصوصیت کے ساتھ جنگِ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ء کے بعد عربوں کے غم وغصہ اور وہاں کے سیاسی 'مدوجزر' کا باعث بنی رہی ہیں۔

ایشیا کے ممالکِ عرب تین سو برس تک عثمانی سلطنت (Ottoman Empire.) کی بدولت جو اُن کی ضروریات اور ان کے تحفظ کی حامل تھی، عالمگیر تلخ سیاسی حقائق وواقعات سے محفوظ رہے، یہاں حاکم ومحکوم کا مذہب ایک تھا اس بنا پر اُن میں اختلاف بالکل ناپید تھا۔ صرف بادیہ نشینوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو غیر ملکی حکومت سے شدید تعصب رکھتا تھا اور ہمیشہ مقابلہ پر تُلا رہتا تھا، یہ واقعہ تو اسی صدی کے اوائل میں پیش آیا کہ تعلیم یافتہ افسروں اور متوسط طبقہ کے افراد کو اپنا شاندار ماضی یاد آیا اور وہ اُسے واپس لانے کے لئے عثمانی سلطنت کے خلاف ایک تحریک کرنے لگے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر کو عثمانی سلطنت کی ذات سے کوئی چشم زخم نہ پہنچا تھا۔ انھیں صرف ترکوں کے ساتھ ہمسری کا خبط تھا۔ نوجوان ترک قبل از جنگ ۱۹۱۴ء سے عربوں کو عثمانی حکومت کے خلاف بھڑکانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اب عرب قومیت کے نام پر شریفِ مکہ کی بغاوت اور ٹرکی کے مقابلہ پر اس کی فوجوں

کی کامیابی نے وہ کام جوان سے نہ ہو سکا تھا پورا کر دیا۔ اس وقت سے شام اور عراق عرب کی قومیت کا جذبہ بھی بھڑک اُٹھا۔

جنگِ عظیم نومبر ۱۹۱۸ء کے خاتمہ کے بعد یہ قوم پرست طبقہ اپنی کامیابی پر بہت خوش اور پرجوش تھا۔ سر ہنری میکموہن (Sir Henry Macmohan.) نے جو خطوط شریفِ مکہ کے نام لکھے تھے ان سے اور پھر فرانس و برطانیہ کی طرف سے شام و عراق کی آزادی کے متعلق جو اعلانات شائع ہو چکے تھے اُن سے عربوں کو یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ اب فوراً ایک خود مختار عرب حکومت قائم ہو جائیگی جس کی حدود مغربی ایشیا کے کل یا اُس کے ایک بڑے حصہ پر مشتمل ہوں گی، لیکن بعد میں جب عربوں کو اس امید میں ناکامی ہوئی تو وہ ان کے لئے سخت ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ (خود مختار عرب حکومت قائم کرنے کے بجائے) برطانیہ نے عراق و فلسطین میں اور فرانس نے لبنان میں قدم جمانے شروع کر دیئے ہیں تو انھوں نے پہلے پہل تو فرانس و برطانیہ کو وعدہ شکنی اور غداری کا مورد قرار دیا اور پھر ناکام تشدد کے مظاہروں سے اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے لگے۔ لیکن ان مظاہروں کا الٹا نتیجہ یہ ہوا کہ شام کی زنجیروں کے حلقے اور ملا دیئے گئے اور فوری اتحادِ عرب کی آخری توقعات بھی پراگندہ ہو کر رہ گئیں۔

مشرق وسطیٰ میں یوں تو بیس برس کے اندر بہت سے انقلابات رونما ہوئے لیکن بنیادی عناصر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ علاوہ اس کے کہ برطانیہ عظمیٰ کا اقتدار فلسطین اور عرب کے دوسرے حصوں پر قائم ہے، مصر، عرب اور عراق بھی برطانیہ کے زبردست اثر کے ماتحت ہیں، دوسری طرف تحریک عراق کے آغاز تک شام اور لبنان پر فرانس کی حکومت قائم رہی۔ ان حالات کی بنا پر عربوں کا قومی جذبہ برابر مشتعل اور اس کا جوش و خروش بڑھتا ہی رہا۔ پھر دونوں پارٹیوں کے باہمی تعلقات ناگزیر طور پر واقعات کی رفتار سے بھی بہت کچھ متاثر ہوئے ہیں، لیکن ان ایام کی مفصل تاریخ بیان کرنے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس قدرتی عمل کے نتائج پر غور کیا جائے۔

فرانس وعرب کے تعلقات پران تغیرات کا بہت کم اثر پڑا، شام پر فرانسیسی انتداب (Mandate) کے قائم ہونے کے وقت ہی شامی مسلمانوں میں انتہائی اشتعال تھا، اس آگ کو فرانس کے نظم ونسق نے اور تیز کردیا۔ شامی عربوں کو فرانسیسی حکومت سے تین بڑی شکایتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ فرانسیسی ارباب اقتدار نے مذہبی اور مقامی رقابتوں کو جو شامی اتحاد کے راستہ میں حائل تھیں کم کرنے کے بجائے ان کے احساسات کو اور ابھار دیا ہے، تاکہ وہ اپنی گرفت خوب مضبوط رکھ سکیں۔ فرانس نے اپنی اس پالیسی کو اس طرح عملی جامہ پہنایا کہ سب سے پہلے لبنان کے عیسائیوں کے تحفظ کی آڑ لے کر لبنان کی سرحدوں کو فوجی نقطۂ نظر سے مستحکم کیا (اگرچہ اس حکمت عملی کی وجہ سے لبنان کے ماروئی عیسائیوں کے حامی تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں رہ گئے) اس میں جنوب اور شمال کے ساحلی علاقے بھی داخل تھے اور اس الحاق کا دامن طرابلس (Tripolis) اور سیڈون (Sidon.) کی بندرگاہوں اور اس زرخیز وسطی نشیبی خطہ تک وسیع تھا جو لبنان اور اینٹی لبنان کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جدید لبنانِ عظمیٰ کو ایک جداگانہ ریاست قرار دیا گیا جس کا صدر اور گورنمنٹ بالکل الگ اور مستقل تھی۔

اب شام کے جو حصے باقی رہ گئے تھے ان میں پھوٹ ڈالنے اور ان میں تقسیم کرنے کی پالیسی کی تکمیل اس طرح کی گئی کہ جنوب مشرق میں جبل دروز میں علوی علاقہ جو لبنانِ عظمیٰ کے شمالی ساحل پر واقع ہے اور جس میں ساحل کے عقبی پہاڑ بھی شامل ہیں۔ پھر ضلع اسکندرونہ جو لبنانِ عظمیٰ کے شمال میں واقع ہے، اور جزیرہ جو دریائے فرات کے مشرق میں ایک عراقی میدان ہے۔ ان سب کا نظم ونسق علیحدہ علیحدہ قائم کردیا گیا۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ جب عراق نہایت تیزی کے ساتھ حکومت خود اختیاری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شام اس وقت بھی نوآبادیاتی نظم ونسق کا ایک جزء لاینفک بنا رہا جس کے ماتحت تمام پبلک محکموں میں بھی فرانسیسی افسروں اور عہدہ داروں کی بھرمار تھی۔ اقتصادی لحاظ سے شام فرانس کے لئے صرف ایک مشین

کی سی حیثیت رکھتا تھا اور اس کے تمام اقتصادی وسائل و ذرائع فرانسیسی دستبرد کا شکار بنے ہوئے تھے۔

۱۹۳۶ء میں حکومت فرانس میں انقلاب پیدا ہوا تو یہ امید بیجا نہ تھی کہ اب اس کی پالیسی میں بھی ردوبدل ہوگا۔ اس بنا پر انتدابی حکومت کی جگہ کسی دوسرے نظام کو قائم کرنے کیلئے گفتگوؤں کا آغاز ہوا، اور اس سلسلہ میں دو معاہدوں پر۔ ایک شام کے ساتھ اور دوسرا لبنان کے ساتھ دستخط بھی ہوگئے۔ سمجھوتہ کی امید میں شام کے قوم پرستوں نے تو یہاں تک کیا کہ لبنانِ عظمیٰ کے حدود کو تسلیم کرلیا۔ لیکن پیرس کے ارباب سیاست نے ترکی کی ان امیدوں کو مطمئن کرنے کے لئے جو اسے معاہدہ سے پیدا ہوگئی تھیں اسکندرونہ اور انطاکیہ کا علاقہ تو ترکی کو دیدیا۔ مگر شام کی قوم پرست جماعت کے مطالبوں پر کوئی توجہ نہیں کی اور پھر نوآبادیاتی طرزِ حکومت وہاں قائم کردی۔ اہلِ شام کی حکومتِ فرانس کے خلاف یہ تیسری اور سب سے زیادہ سخت شکایت تھی۔

اب رہا برطانیہ عظمیٰ کا معاملہ تو اگرچہ شروع شروع میں عربوں کو برطانیہ کے ساتھ اس قدر شدید دشمنی نہیں تھی جتنی کہ فرانس کے ساتھ تھی مگر پھر بھی عراق اور مصر میں جو تصادم انگیز ہنگامے برپا ہوئے تھے اور پھر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی جو تحریک جاری تھی، ان سب چیزوں نے برطانوی شہنشاہیت کے منصوبوں کی طرف سے عربوں کے دلوں کی بدگمانی کو پہلے سے زیادہ قوی کردیا تھا۔ یہ بدگمانی کبھی کم نہیں ہوئی اور برابر بڑھتی ہی رہی۔ اتنا ضرور ہوا کہ برطانیہ نے جب بڑے پیمانہ پر مصر و عراق سے معاہدہ کرلینے پر آمادگی ظاہر کی تو یہ شکوک و شبہات کسی حد تک کم ہوگئے۔ پھر چند سال بعد سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے قوی اثر نے بھی دوستانہ تعلقات پر اچھا اثر ڈالا۔ مگر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تحریک کے باعث بے چینی بڑھتی ہی رہی، فلسطین کے مفتیِ اعظم نے اپنی تمام توجہات اس تحریک کے مقابلہ کے لئے وقف کردیں۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک کے درمیانی زمانہ میں جب یہودی کثرت سے فلسطین میں آکر آباد ہونے لگے۔ اور پھر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء کے درمیان جب فلسطین میں باغیانہ

سرگرمیاں حد سے متجاوز ہوگئی، عربوں کی قلبی بے چینی اور برطانیہ کی طرف سے ان کی بے اعتمادی کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد اگست ۱۹۳۸ء میں سلطان ابن سعود کی طرف سے بھی برطانیہ کی صیہونی پالیسی کے خلاف ایک سرکاری احتجاجی اعلان شائع ہوا، اور اس کی وجہ سے قوم پرستوں کا غیظ و غضب حد سے زیادہ ہوگیا ان حالات کی وجہ سے اگر برطانیہ کو ستمبر ۱۹۳۸ء میں جنگ کے اندر کود نا پڑتا تو مشرق وسطی میں ایک نہایت خطرناک صورتِ حالات پیدا ہوجاتی، یہ صحیح ہے کہ لندن کی فلسطین کانفرنس اور برطانی پارلیمنٹ کی فلسطین کے لئے قرطاس ابیض کی منظوری نے حالات کا رُخ پلٹ دیا۔ لیکن ابھی تک یہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ حالات اپنی اصلیت پر آگئے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ ایک دفعہ اور برطانیہ عظمیٰ اور عربوں کے تعلقات نئی امیدوں کے ساتھ تھوڑے بہت خوشگوار ہوگئے۔

ایک اور پیچیدگی جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے وہ انگلستان اور فرانس کی لیوانٹ (Levant) یعنی بحر روم کا مشرقی حصہ اس کا ساحل اور جزائر وغیرہ کے بارے میں پرانی رقابت کا احیا تھا، بیس سال کی پوری مدت اسی کشمکش کی نذر ہوگئی۔ یہاں بحث اس سے نہیں کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اثرات کیا ہوئے؟ شام کے فرانسیسی افسروں کو آخر دم تک یہ یقین تھا کہ انکی دشواریوں کی وجہ برطانیہ کی خفیہ ریشہ دوانیاں ہیں پھر برطانیہ نے جب اپنے زیر نگیں علاقوں میں فرانس کو مراعات دینے پر آمادگی ظاہر کی تو طبعی طور پر اس عمل مراعات نے شام کی اندرونی بے چینی کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اور اس سے فرانس والوں کی ناراضگی بڑھ گئی۔

سالہائے مابعد میں سرکاری تعلقات اگرچہ خوشگوار رہے۔ لیکن فرانس کو یہ اندیشہ برابر لگا رہا کہ برطانیہ نے فرانس کو شام سے بالکل بے دخل کردینے کا مخفی طور پر ارادہ کر رکھا ہے دوسری طرف شام کے قوم پرستوں پر فرانس کی اس ضد کا بھی اچھا اثر نہیں پڑا کہ شام کو مغربی ایشیا کے اس بنیادی نظام سے خارج رکھا جائے جسے اس کے ہمسایہ ملکوں کی اساسی ترقی کے لئے برطانیہ کے ممتاز مدبرین ضروری سمجھتے تھے

اس دوران میں عربوں کی قومی تحریک بھی خاموش نہیں رہی، جنگِ عظیم کے بعد انھیں سخت مایوسی ہوئی تھی، اس مایوسی نے ان کے احساس کو اور تیز کر دیا تھا اور رائے عامہ کی یہ آرزو تھی کہ عربوں کی ایک متحدہ ریاست کا قیام عمل میں آئے۔ ایک موہوم امید کی بنا پر ہی اس کا خاکہ اور دستور بھی ۱۹۲۰ء تک بنا لیا گیا تھا اور اب اس کیلئے عملی جدوجہد بھی شروع کر دی گئی، عربوں کی ترکی سے علیحدگی کے بعد اس جدوجہد کی پہلی منزل یہ قرار دی گئی کہ مسلمانوں کو یورپین اقتدار اور نفوذ و اثر سے آزادی دلائی جائے۔ اگرچہ یہ تحریک خالص اسلامی تحریک تھی لیکن پھر بھی عرب ہونے کی حیثیت سے عرب عیسائیوں کو اس تحریک میں نمایاں حصہ لینے سے نہیں روکا گیا تھا۔ ۱۹۲۰ء کی عراق کی شورش اور ۱۹۲۵ء کی شام کی بغاوت قومی سے زیادہ مسلم تحریکیں تھیں۔ بعد کی شام و عراق کی تمام تحریکیں اسلامی جذبہ کے ماتحت تھیں۔ اس جذبہ کو اگر بین الاقوامی جذبہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اسلام نے انھیں ایک رشتہ سے باندھ رکھا تھا۔ اور ان کے مذہبی عناصر کا ان تمام کانفرنسوں میں غلبہ رہا جو وقتاً فوقتاً اس غرض سے منعقد ہوئی تھیں کہ عربوں کے مشترک مسائل کی پالیسی میں یکجہتی پیدا کی جائے اور اتحادِ عرب کی تحریک کو چند خاص مقاصد پر مبنی کر کے چلایا جائے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کی قومی تحریک مراکو سے عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔

اتحادِ عرب کے اس عالمگیر جذبہ کے ساتھ ہر ایک عرب ملک میں وطنیت کا شدید احساس بھی موجود تھا۔ لیکن وطنیت کا یہ احساس کیسا ہی کیوں نہ ہو، اتحادِ عرب تحریک کی راہ میں رکاوٹ کے جذبات اور مقاصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تھا۔ عربوں کو اس کا پورا یقین تھا کہ مقامی طور پر زیادہ سے زیادہ طاقت و قوت حاصل کر کے مستقبل میں ایک عظیم الشان حکمراں عرب مملکت قائم کی جا سکیگی۔ موجودہ وقت میں ممکن ہے کہ یہ احساس عربوں کی مختلف حکومتوں کے اندر فکر و عمل میں اتحاد پیدا کر دے اور انھیں ایک مرکز پر لے آئے، لیکن ڈر اس کا بھی ہے کہ وطنیت کا یہ جذبہ اپنے دائرۂ عمل تک ہی محدود ہو کر رہ جائے، اس کے آثار تقریباً ہر عرب ملک میں نظر آنے لگے ہیں، خصوصاً جہاں نوجوانوں کی کوئی پرجوش تحریک موجود ہے۔

عرب نوجوانوں کی موجودہ نسل جنگِ عظیم کے بعد اضطراب انگیز ماحول کی پیداوار ہے۔ ان نوجوانوں کو یاد ہے کہ ان کے بزرگوں نے محبانِ وطن کی حیثیت سے برطانیہ یا فرانس کسی نہ کسی کے خلاف جنگ کی تھی، پھر ان کی تعلیم میں مظاہرے، ہڑتالیں اور ہنگامے بھی داخل ہیں جو حبِ وطن کے مقدس نام پر کئے جاتے ہیں یہ پودا ان چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے جن کی وجہ سے ان کے بزرگوں نے ناکامیاں اٹھائی تھیں یعنی اپنی نجی دلچسپیوں کی تلاش میں رہنا، دفتروں کی خاک چھاننا، فارمولوں کے فریب میں آجانا وغیرہ، یہ جوان خون اپنے مذہب اسلام کی صلح جویانہ پالیسی کو بھی پسند نہیں کرتا، ان کا مسلک لڑنا ہے اور یہ خیال انھیں غیرت دلاتا ہے کہ اتنی مدت سے عالم اسلامی پر غیروں کا قبضہ ہے اور انھیں تلوار کے ذریعہ نکال باہر نہیں کیا گیا۔ ان پر جرمنی و اٹلی کی نمایاں کامیابی کا افسوں ہے، جنھوں نے باوجود اقلیتوں میں ہونے کے ملکوں پر تسلط قائم کر لیا ہے اور اپنے عزم سے دنیا کو مرعوب کر دیا ہے۔

(باقی آئندہ)

ترجمۂ قرآن کیلئے ایک مفید اور معتبر کتاب

تیسیر القرآن

صوبۂ بہار کے مشہور عالم مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی نے اس کتاب کو براہِ راست فہمِ قرآن کے لئے بڑے سلیقہ اور جانفشانی سے مرتب فرمایا ہے۔

اس کتاب کی مدد سے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ سال ڈیڑھ سال میں پیدا ہو سکتی ہے، بشرطیکہ مؤلف کے بتائے ہوئے طریقہ پر توجہ سے عمل کیا جائے

کتاب عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہونے کے لائق ہے صفحات ۸۰ بڑی تقطیع قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ

منیجر مکتبہ برہان قرول باغ دہلی